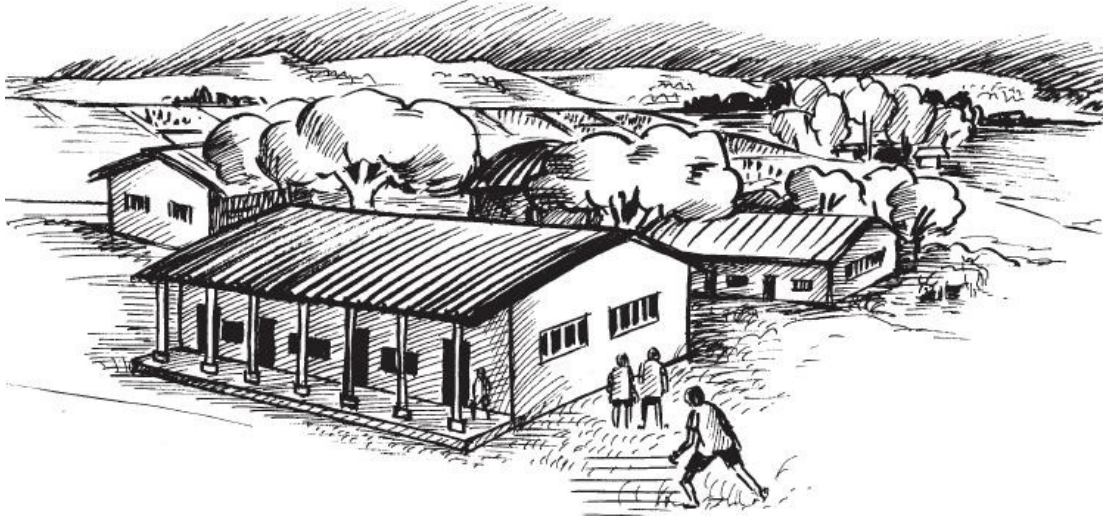


میراجادوئی سکول



مصنف: ڈاکٹر ابھئے بنگ

اُردو ترجمہ: محمد زبیر



میراجادوئی سکول

بچپن میں میں ایک انوکھے سکول میں پڑھا تھا۔ ویسی تعلیم میں آج اپنے بیٹے آئندہ کو نہیں دے سکتا۔ یہ میری زندگی کا سب سے بڑا دکھ ہے۔ میرے بچپن کی بات ہی کچھ زبانی تھی۔ اب وہ بات کہاں رہی۔ اکثر بڑے بوڑھوں کو آپ نے اس طرح کی بات کرتے سنا ہو گا۔ پھر بھی میرے دل میں گہرا دکھ ہے۔ آخر میرے سکول میں ایسی کیا بات تھی؟

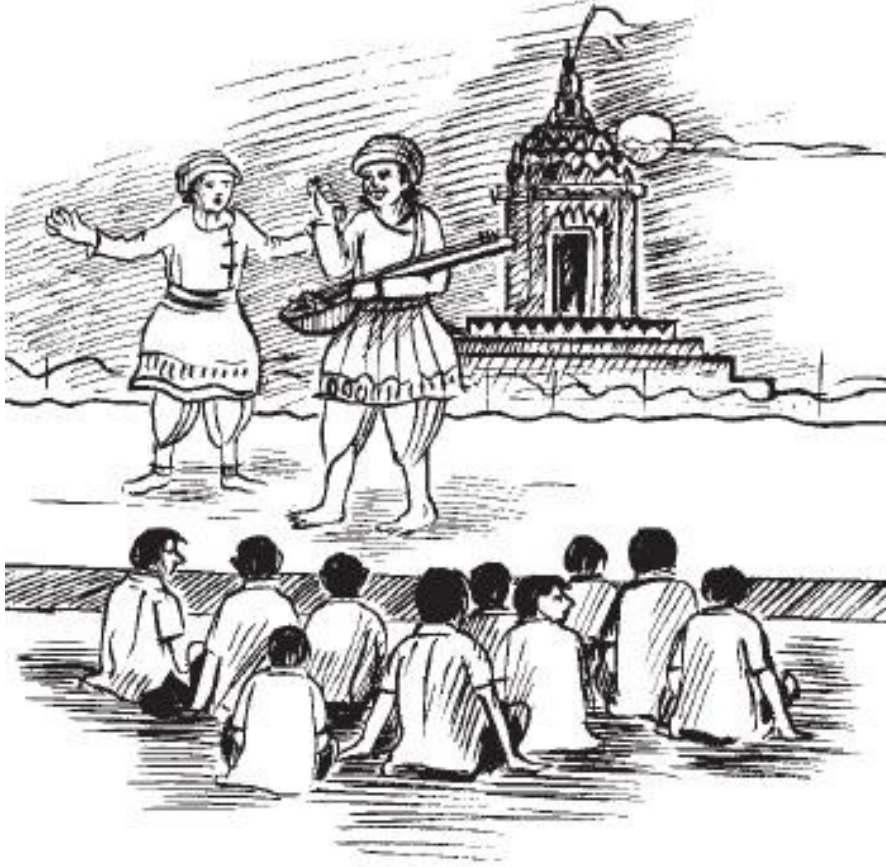
نویس جماعت تک میری پڑھائی گاندھی جی کی نئی تعلیمی پالیسی کے مطابق تھی۔ اُس میں سے پورے چار سال تو میں نے سیواگرام آگرم کے نئے تعلیمی ادارے میں گزارے۔ تعلیم کا مطلب یہ نہیں کہ ہم قدرت کو چھوڑ کر، جماعت کی چار دیواری کے درمیان سے ہو کر کسی عام سبق کو پڑھیں۔ اس کے دوسری طرف گاندھی جی کی نئی تعلیم کا تو یہ ماننا تھا کہ قدرت کے قریب رہ کر اور معاشرے کو فائدہ دینے والے کام کر کے ہی عقل کی ترقی ہوتی ہو گی اور ان کے مطابق بچے مختلف مہارتیں حاصل کریں گے۔ اس طریقے کی ترقی کے لیے گاندھی جی کے کہنے پر رویندر ناتھ ٹھاکر نے شانتی نیکیتن سے جناب آریئے نائیٹکن اور محترمہ آشادپوری کی سنگلی بنگالی جوڑی کو سوگرام بھیجا تھا۔ اسی وجہ سے گاندھی جی کی تعلیمی کاوش کو رویندر ناتھ کا فطرت اور فن کا پیار ملا تھا۔ سکول کی شروعات سے ہی میرے ماں باپ اس عمل میں شامل تھے۔ اس سکول کے پڑھائی کے طریقے ایک دم نایاب تھے۔ اُن طریقوں کی کچھ مثالیں میں یہاں پیش کر رہا ہوں۔

جانوروں سے تعارف

آج تو سبھی جگہ جنگلی جانوروں کے تحفظ کی بات ہوتی ہے۔ لیکن 27 سال پہلے یہ موضوع اتنا اہم نہیں تھا۔ تب ہمارے مراٹھی کے استاد پائل گروہی، اپنی کلاس کٹھل کے درخت کی شاخ پر بیٹھ کر چلاتے تھے۔ وہ ہمیں جنگلوں کی کہانیاں اور خود کے اپنے شکار کے قصے سناتے تھے۔



ایک بار غلطی سے انہوں نے ایک حاملہ ہرنی پر گولی چلا دی۔ اُس معصوم جاندار کی آنکھوں کا درد دیکھ کر وہ سہم گئے۔ اس بات سے انہیں اتنی تکلیف ہوئی کہ انہوں نے ہندوق کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا اور پھر کیمرے سے جانوروں کی تصاویر لینے لگے۔ انہوں نے رات رات بھر درخت کی مچان پر بیٹھ کر جنگلی جانوروں کی انوکھی تصاویر لیں۔ جانوروں کے لئے محبت ان کی کہانیوں میں صاف نظر آتی تھی۔ ان کی کہانیوں کو سن کر ہمیں ایسا لگتا تھا جیسے ہم خود ہی جنگل کی سیر کر رہے ہوں۔ وہ الفاظ کے دھنی تھے۔ الفاظ میں وہ جنگل کی تصویر کھینچ دیتے تھے۔ جنگل کے بارے میں میری محبت اور معلومات انہی کہانیوں سے بڑھی۔ آج کل کی کتابوں میں مراٹھی زبان کا سبق "پراہیہ" ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے "جاندار کا مطلب ہوتے ہیں جانور"۔ بھالا ایسے بے رس اور بے لطف طریقے کیا کبھی بچوں کو راغب کر سکیں گے؟ مہاراشٹر کا گاڑچولی ضلع آج بھی جنگلوں سے بھرا ہے۔ پروہاں بھی سکول کی تعلیم کا اصلی جنگلوں سے دور تک کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔



سنت ٹکارام کے ابھنگ (دوہے) بھی ہمیں کڑوی دوا کے طور پر نہیں پینے پڑے۔ آٹاڑھ کی ایک رات کو ہمارے سکول میں ہر سال سنتوں کا ایک میلہ لگا کرتا تھا۔ اس میں الگ الگ سنتوں کی زندگی کے بارے میں بتایا جاتا تھا۔ نائک کھیلے جاتے تھے۔ تصاویر بنائی جاتی تھیں۔ یہ سب کام سکول کے سبھی بچے مل کر کرتے تھے۔ ٹکارام کے ایک ابھنگ 'جے کارنجلے گنجے' کو میں نے وہاں تین الگ الگ طرح سے سیکھا۔ وہاں کی گیت منڈلی میں میں نے پہلی بار راگ بھیروی بھی گانا سیکھا۔ سنتوں کی وانی، اُن کی تاریخ، اُن کی زندگی وغیرہ ہم نے کھیل کھیل میں مفصل سیکھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہاں سیکھنے میں زبان، تاریخ، موسیقی اور منظر کشی کے لیبل نہیں چپکے تھے۔

کئی سالوں بعد میں ایک سرکاری سکول میں گیا وہاں مجھے 'منظوم کُسمانجلی' نام کی ایک بھاری بھر کم نصابی کتاب میں سنت ٹکارام کا 'جے کارنجلے گنجے' ابھنگ نظر آیا۔ اُسے دیکھ کر شاید ٹکارام دُکھی ہوئے۔

ایسے سیکھا علم نباتات

بہت سے سکولوں میں نباتاتی علم کے موضوع کو کتابوں میں چھپی تصاویر یا پھر کالج کی بوتلوں میں قید 'سیپسمن' (نمونوں) کے ذریعے پڑھایا جاتا ہے۔ پودوں کی الگ الگ اقسام کی جڑوں اور پتوں کے جڑا توڑ مکینیکی ناموں کو بچے بڑی مشکل سے رٹتے ہیں اور امتحان کے فوراً بعد انہیں بھول جاتے ہیں۔ ہماری نئی تعلیم کے سکول کے آس پاس باغوں اور کھیتوں میں طرح طرح کی اقسام کے درخت اور پودے تھے۔ وہاں پر پودوں کا تجزیہ، مطالعہ ہوتا تھا۔ جو بھی درخت، پودے نظر آتے تھے، سب سے پہلے اپن کے نام سے شناسائی کرائی جاتی تھی۔ پھر ان کے پتوں، پھولوں، پھلوں کا باریکی سے معائنہ کیا جاتا تھا۔ اُس کے بعد بیر، آملہ وغیرہ پھلوں کو توڑ کر کھانے کی باری آتی تھی۔ (جماعت میں اس طرح چیزوں کو چکھ کر یا کھا کر سیکھنے کا دوسرا تجربہ مجھے امریکہ میں ہوا۔ لیکن وہاں کلاس میں بیٹھ کر چاکلیٹ کھانے اور کوا کو لاپینے کی روایت دکھائی دی۔) پھل کھاتے کھاتے بیر اور آم کی مطابقت پر بحث کرتے اور 'ڈرپ' نام کے پھل کو دیکھ کر اُس کی خصوصیات کو کافی گہرائی اور باریکی سے سمجھ پائے۔ باٹنی (علم نباتات) کی کتابوں میں جن نظریات کا بیان ہوتا ہے وہ ہمارے چاروں طرف ہریالی کی صورت میں بکھرے پڑے تھے۔ انہیں اپنے سامنے دیکھے اور جانچ پرکھ کرنے کی ترغیب ہمیں ہمارے اساتذہ دے سکے۔ اسی وجہ سے 'پامیٹ، ڈایورجٹ ریٹیکولیٹ' جیسے بھاری بھر کم الفاظ مجھے اٹ پٹے نہیں لگتے۔ اس کی وجہ آسان تھی۔ میرے پاس آنکھوں کے سامنے پیپتے کے

درخت کا پتاجو تھا۔



ساتویں کے امتحان کے لیے ہمارے استاد نے ہم سے الگ الگ پتوں اور پھولوں کی ایک سائنسی الیم بنانے کو کہا۔ ہم نے اس کے لیے اپنے پاس پڑوس کا پورا علاقہ چھان مارا۔ آج 25 سال گزرنے کے بعد بھی سیواگرام کے علاقے میں کہاں

کہاں پامیٹ ڈایورجٹ ریٹیکولیٹ شکل کے پتوں کے درخت لگے ہیں، اس سے میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہ درخت ابھی میری آنکھوں کے سامنے کھڑے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعد میں کالج کے دنوں میں مجھے علم نباتات سیکھنے میں کوئی خاص محنت نہیں کرنی پڑی۔ اس موضوع پر میں پورے کالج میں اکیلا تھا۔ جب میرے کالج کے پروفیسر میری تعریف کرنے لگے تو میں نے اپنے بارے میں یہ بات کہی کہ۔ "سر میں نے علم نباتات کالج میں نہیں سیکھا، اُسے تو میں نے اپنے سیواگرام کے سکول میں سیکھا تھا۔"

زندگی سے رشتہ جوڑنے والی ریاضی

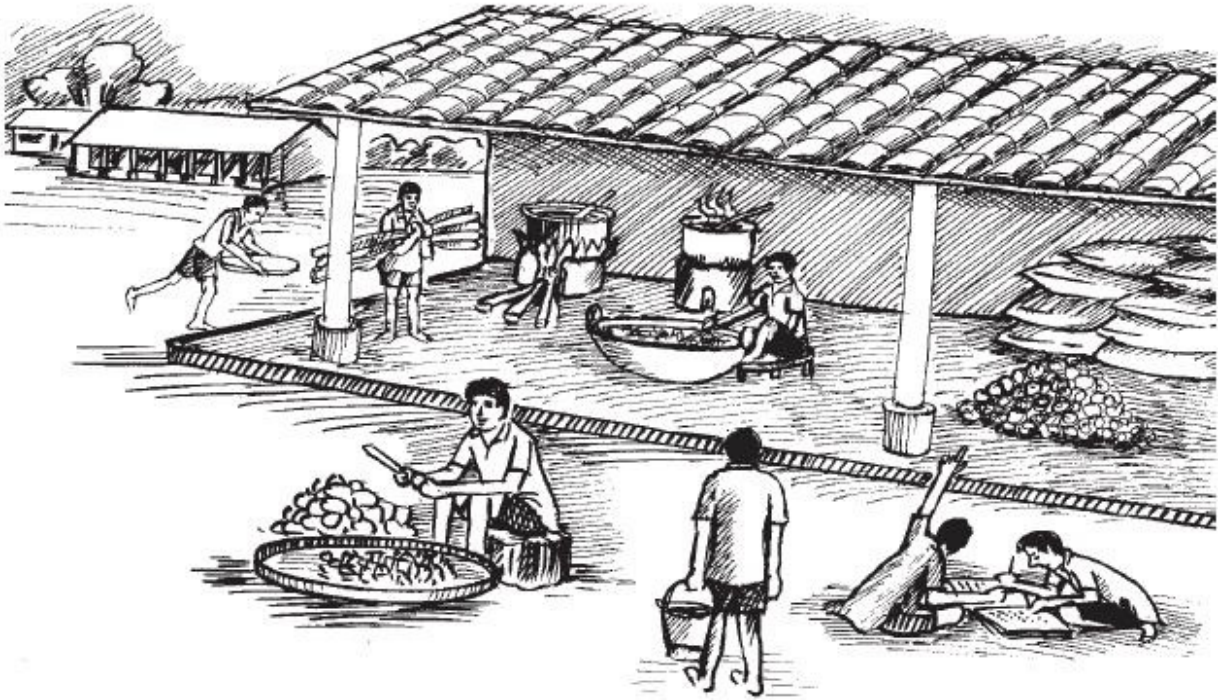
" ایک پانی کی ٹنکی (ہود) میں دو ٹوٹیاں لگی ہیں۔ ایک ٹوٹی سے ٹنکی میں پانی بھرا جاتا ہے اور دوسری سے خالی ہوتا ہے۔ اب یہ بتاؤ کہ ٹنکی کتنی دیر میں بھرے گی؟" اس طرح کے بے سرپیر کے سوال ہی اکثر ریاضی کی نصابی کتابوں میں بھرے ہوتے ہیں۔



اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ ریاضی اور اصلی زندگی کے درمیان کچھ تعلق ہے یا نہیں۔ کوئی بھی ہوشیار انسان اس سوال کو حل کرنے کے لیے نیچے والی ٹوٹی کو بند کر دے گا اور سوال سے اپنا آپ چھوڑالے گا۔ نئی تعلیم کالج میں میں نے آمد کے اصول اور ریاضی کس طرح سیکھی اس کا ایک نمونہ دیتا ہوں۔ ہر روز ہم لوگوں کے لیے تین گھنٹے کوئی پیداواری کام کرنا لازمی تھا۔ یہاں کی تعلیم کا یہ ایک لازمی حصہ تھا۔ اس کے پیچھے گاندھی جی کی "بریڈ لیبر" یعنی خود کام کر کے کھانا حاصل کرنے خواہش تو تھی ہی ساتھ ہی معاشرے میں پیداواری کام کے ذریعے مہارتیں حاصل کرنے کی خواہش بھی تھی۔ اس طرح میں کچھ دنوں تک گوشالہ میں کام کرنے کے لیے جانے لگا۔ نئی گوشالہ کا تعمیری کام شروع تھا۔ میرے استاد نے مجھے ایک مسئلے کا حل تلاش کرنے کی ذمہ داری سونپی۔ "یہ معلوم کرو کہ ایک گائے روزانہ کتنا پانی پیتی ہے۔ اس طرح گوشالہ کی سبھی گایوں کی یومیہ پانی کی ضرورت کتنی ہوگی۔ پھر ایک ایسی ٹنکی تعمیر کرو جس میں اتنا پانی آ سکے۔ ٹنکی میں کتنی انٹیں لگیں گی۔ اس کا حساب کر کے انہیں خرید کر لاؤ۔" ریاضی کے اس مسئلے سے میں لگ بھگ ایک ہفتہ الجھتا رہا۔ الگ الگ ٹنکیوں کا رقبہ کیسے ناپیں؟ ٹنکی کا رقبہ، قطر کیسے ناپیں؟ اس انوکھے طریقے سے میں نے مطلوبہ ٹنکی بنا کر ریاضی کا علم سیکھا۔

کھانا پکانے کے بارے میں تعلیم

کام کے ذریعے سائنس کی ایک اور مثال میں یہاں دے رہا ہوں۔ شاگردوں کو باری باری سے کھانا بنانے کی ذمہ داری سونپی جاتی تھی۔ سکول کے باورچی خانے میں روزانہ لگ بھگ 100 لوگ کھانا کھاتے تھے۔ کھانا پکانے کا ذمہ باری باری سے آٹھ لوگوں کی ایک ٹولی کو سونپا جاتا تھا۔ کھانے کے اوپر ماہانہ کتنا خرچ ہونا چاہئے اُس کا بجٹ ٹولی کی پہلے ہی بتا دیا جاتا تھا۔ غذائیت کے اعتبار سے کھانا متوازن ہو۔ کھانا سب کو پسند آئے اور اس کا خرچ بجٹ کے اندر ہو، اس کا منصوبہ بناتے بناتے ہمارے چھکے چھوٹ جاتے تھے۔ آلو کی سبزی سب سے سستی ضرور تھی لیکن اُس میں غذائی اعتبار سے سٹارچ زیادہ تھا، اس لیے اُسے رڈ کرنا پڑا۔ آئی سی ایم آر (انڈین کونسل فار میڈیکل ریسرچ) کے ذریعے بتائے گئے کم سے کم تیل کی مقدار کے استعمال سے تو

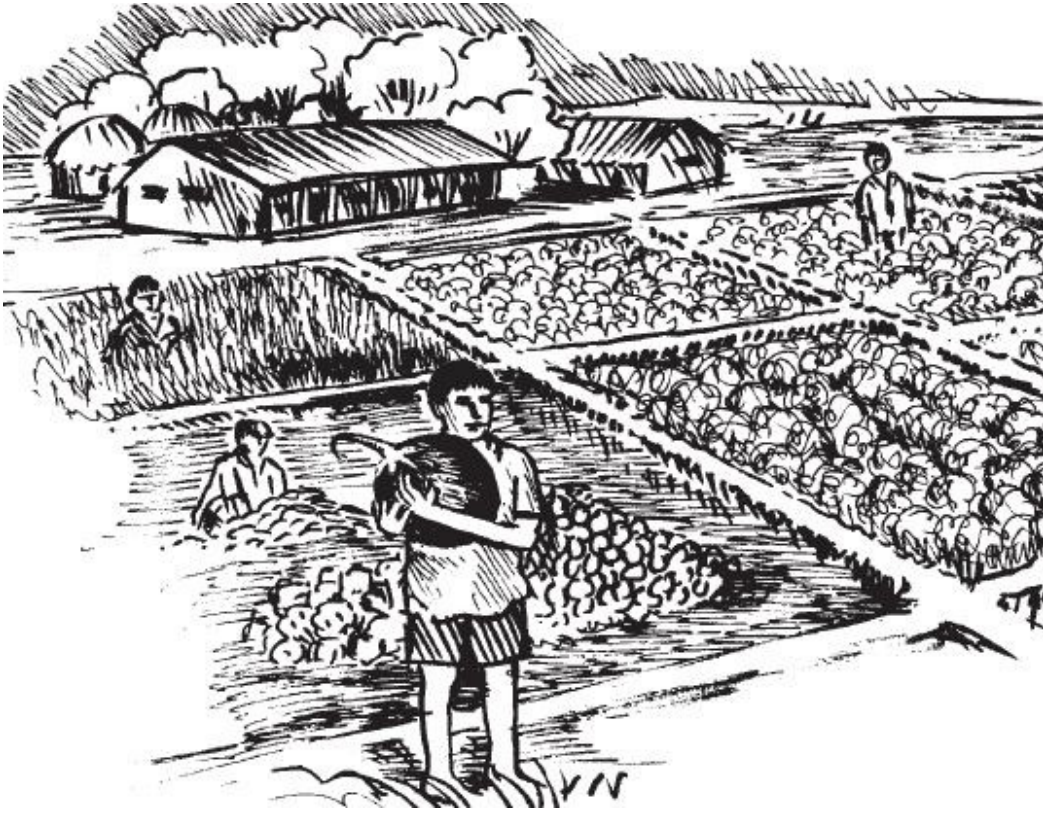


سارا بجٹ صرف تیل پر ہی خرچ ہو جاتا۔ ایک ماہر گھریلو خاتون کے تجربے سے میں ابھی محروم تھا۔ ہم غذائی علوم اور علم الارض سے لڑتے، مشقت کرتے ہوئے کوئی حل کھوجنے کی خواہش کرتے۔ بہت بار کھانے کا بنایا ہمارا منصوبہ بس کاغذی ہوتا۔ حقیقت میں اُسے بنانا ممکن ہی نہ ہوتا۔ دال کو گلنے میں کتنا وقت لگے گا، اس حساب میں بھی ہم اکثر مات کھاتے۔ پھر رات کو کھانے کے سارے برتن گھستے، مانجھتے ہوئے ہم اپنے آپ کو ایک زخمی فوجی محسوس کرتے تھے۔ اگلے دن پھر کھانا پکانے کا مسئلہ سامنے منہ بنائے کھڑا رہتا تھا۔

لیکن اس پورے عمل کے دوران ہم تین چیزیں اچھی طرح سیکھ گئے۔ وہ تھیں علم غذائیت، گھریلو معاشیات اور کھانا بنانا۔ دھنیے کے ہرے پتوں میں 10,600 یونٹ وٹامن اے کی مقدار ہوتی ہے، یہ مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے۔ جو چیزیں میں نے چند دنوں میں باورچی خانے میں کام کر کے سیکھیں، وہ میں دس سالوں میں میڈیکل کالج میں نہیں سیکھ پایا۔

زراعت کے تجربے

ہم سبھی شاگردوں کو کھیتی کے لیے زمین کا ایک ایک چھوٹا ٹکڑا دیا گیا تھا۔ اُس کی جتنائی، بوائی، سنچائی، کھاڈا ڈالنے وغیرہ کی سب ذمہ داری ہماری تھی۔ سنچائی کے لیے کنوئیں سے پانی نکالنے کے لیے بچوں کی لمبی لائن لگ جاتی تھی۔ اس لیے کئی بار تو وہاں رات کو ہی نمبر آتا تھا۔ آدھی رات کو گیدڑوں کی ہواں ہواں سے اکثر بچوں کا دل کانپ اٹھتا تھا، پھر بھی وہ ہمت کر کے اپنے کھیتوں میں پانی سنچنے جاتے تھے۔ کھیتی کرتے کرتے ہم نے اگر ونومی اور پھلوں کی کھیتی کا بھی علم حاصل کیا۔ کھاڈا ڈالتے وقت اُس کے کیمیائی اجزاء کو جاننا ضروری ہوتا اور اس کے لیے ہمیں کئی بار ماہر کسانوں کے پاس جا کر بات چیت کرنی پڑتی تھی۔



ان میں
جاپان سے دھان کی
اعلیٰ درجے کی کھیتی
سیکھ کر آئے
مکتیشور بھائی
اور انگوروں کی کھیتی
کا پہلا تجربہ کرنے
والے پرم بھائی
شامل تھے۔ ہمارے
قریب ہی اسرائیل
میں بہت سال کھیتی
سیکھ کر آئے جناب
ہلیوی کا کھیت تھا۔ وہ

ہیلوی کی جگہ گھوڑوں کی مدد سے کھیت کی جتنائی کرتے تھے۔ بیچ بیچ میں ہمیں انا صاحب سا ہسٹر بُدھدے "کھیتی سے متعلق ارضیات کے نئے نئے تجربے سُجھاتے تھے۔ ایسے ماحول میں ہم نے کھیتی کرتے کرتے کیا کیا نہیں سیکھا؟

کس کے کھیت میں زیادہ پیداوار ہوگی اس بات کو لے کر شاگردوں میں گھوڑ لگی رہتی تھی۔ پیداوار بڑھانے کی فکر میں ہم کھت میں خوب کھاڈا یعنی بالٹی بھر بھر کر گوبر ڈالتے تھے۔ اس طرح گوبر ڈال ڈال کر میں نے پونے دو کلو کا ایک بیگن اگایا! جب اُس بیگن کو میں وردھا کے بازار میں بیچنے گیا تو اُسے خراب سمجھ کر کسی نے خریدا ہی نہیں!

زندگی کی تعلیم



نئی تعلیم پر اکثر ایک الزام لگایا جاتا ہے۔ سکول میں شاگرد جسمانی مشقت میں جتنا وقت صرف کرتے ہیں وہ اُس کے حصولِ علم کے راستے میں رُکاوٹ بنتا ہے۔ مدراس میں جب بنیادی تعلیم شروع ہوئی تب لوگوں نے الزام لگایا "جسمانی مشقت کی وجہ سے ہمارے بچوں کی پڑھائی پیچھے چھوٹ رہی ہے۔" اس الزام کی وجہ سے وہاں کے موجودہ وزیر اعلیٰ راجا جی کو استعفیٰ دینا پڑا۔ لیکن اصلیت کیا ہے؟ بچوں کے دماغ میں تمام اجڑا کچرا معلومات بھرنا اور اُسے امتحان میں اگل دینے کو ہی لوگ سہی تعلیم ماننے ہیں، انہیں ضرور یہ الزام صحیح لگا ہوا گا۔ اگر بچہ گندھک کے عمل کو بنانے کے چار الگ الگ طریقوں کو نہیں بتا سکتا تو اُس کا علم کچا ہے، ایسا اس گروہ کا ماننا ہے۔ نویں جماعت کے طالب علم کو اس معلومات سے کیا فائدہ ہو گا، اس سے انہیں کچھ فائدہ نہیں ہو گا۔ پر زندگی سے جڑے ہر علم کے شعبے میں نئی تعلیم کے طالب علم کہیں زیادہ ماہر پائے گئے۔ لیکن تاریخ، جغرافیہ، سیاست اور عام علوم جیسے موضوعات میں اُس کی کیا حالت تھی؟

جغرافیہ کا موضوع میں نے اپنے جادو بھرے سکول میں رسمی طور پر نہیں سیکھا۔ سیواگرام میں ملکی، غیر ملکی بہت سے لوگ آتے تھے۔ اُن سے الگ الگ ممالک اور علاقوں کے بارے میں سُن کر میں نے بہت اچھا سیکھا۔ مجھے مختلف ممالک کے ڈاک ٹکٹ اکٹھے کرنے کا بہت شوق تھا۔ اس سے مجھے دُنیا کے الگ الگ ممالک کے بارے میں کافی دلچسپ معلومات بھی ملتی تھی۔ بہت سے سفر نامے اور ملکی غیر ممالک کی کہانیاں پڑھ کر مجھے اُن ممالک کی آب و ہوا کا اچھا خاصا علم ہو گیا تھا۔ اس طرح میں نے جغرافیہ سیکھا۔ جب میں نویں جماعت میں تھا میں نے شرتچند کی 'پتھیر دیوی' اور جھویر چند میگھانی کی لکھی 'پر بھو پدھارے' پڑھا تھا۔ اس سے میرا برآمدیس سے اچھا خاصا تعارف ہوا۔ ان دونوں کتابوں میں ترغیب ہی ایک دن مجھے برما کھینچ کر لے جانے کی وجہ بنی۔ میرے لیے جغرافیہ ایک بوجھل موضوع نہ ہو کر ایک زندہ موضوع تھا۔

سیاست اور معلومات عامہ پڑھنے میں بھی ہمارے اُستادوں نے الگ ہی راستہ اپنایا تھا۔ ہر راز شام کے وقت وہ ہمیں اخبار میں سے خاص خاص خبریں اور دلچسپ معلومات پڑھتے تھے۔ بعد میں وہ ہمیں اُن حادثات کی تاریخ اور اُن کے لیے امریکہ کی طرف سے کی گئی کاروائی اُس وقت کی ایک خاص خبر تھی۔ اس کے بعد دوسری عالمی جنگ چھڑی جس نتیجے میں دُنیا دو خیموں یعنی سرمایہ دار اور کمیونزم میں بٹ گئی۔ ہمارے اُستاد زُوس اور امریکہ کے درمیان روایتی دشمنی کی وجہ بھی ہمیں سمجھاتے تھے، اور کیوبا کے انقلاب کی اہمیت بھی بتاتے تھے۔ سویزر لینڈ کے لوگ خود اپنے ملک کو ہیلوئیڈیوے کیوں کہتے ہیں؟ یہ سوال ڈاک ٹکٹ اکٹھا کرتے ہوئے میرے سامنے آیا۔ اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کے لیے ہم نے بہت سی کتابیں پڑھیں اور اس طرح ہمارا اُس ملک کی تاریخ سے بھی اچھی طرح تعارف ہو گیا۔

نیا طریقہ

گاندھی جی کی تعلیم کے اصول اور راند نہ تھاکے فن کی محبت کو تصویری شکل دینے کے لیے ہمارے سکول میں کئی تعمیری تجربات کیئے گئے۔ ان کی کئی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ امتحان میں آئے سوالوں کے علاوہ بھی ہمارے کئی امتحانات لئے جاتے تھے۔ جیسے کھانا پکانا، نائک لکھنے سے کھیلے تک، بھری محفل میں تقریر کرنا، کہانیاں لکھنا وغیرہ۔ سب سے انوکھا تجربہ تو یہ تھا کہ جماعت کے تصور کو بہت چکدار بنادیا گیا تھا۔ سبھی طالب علم کچھ موضوعات میں زیادہ تیز ہوتے ہیں اور کچھ میں تھوڑے کمزور۔

اُنہیں ہر موضوع کے لیے ایک ہی جماعت میں بیٹھنا ضروری نہیں تھا۔ اپنی صلاحیت اور سطح کے مطابق بچے کسی ایک موضوع کو سیکھنے کے لیے الگ الگ جماعتوں میں بیٹھ سکتے تھے۔ اِس کا مطلب یہ تھا کہ میں نے ایک سال میں ساتویں کی انگریزی، نویں کی ریاضی اور دسویں کی مراٹھی۔ اچھے اصولوں کی تعمیر اِس تعلیم کا ایک خاص حصہ تھی۔ کام کے بارے میں احترام، مساوات اور اجتماعیت جیسی باتیں ہم سکول کے زمانے میں روز ہی سیکھتے تھے۔ اِن اصولوں کے ساتھ ساتھ ملک میں چل رہی معاشرتی تبدیلی کی تحریکوں میں بھی طالب علم حصہ لیتے تھے۔ ہر سال کچھ دنوں کے لیے سکولم میں تالا لگا دیا جاتا تھا اور سارے طالب علم بھودان اندھولن میں حصہ لینے کے لیے دُور دراز کے گاؤں میں جاتے تھے۔

آج جب میں اپنے بچپن کے سکول کے بارے میں لوگوں کو بتاتا ہوں تو زیادہ تر لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں "کیا ابھی بھی وی سکول چل رہا ہے؟ ہم اُس میں اپنے بچے کو بھیجنا چاہیں گے۔" اپنے سکول کی یہی آخری بات میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں۔

گاندھی جی کی گرام اودیوگ کی کوشش کو حکومتی مدد نہیں ملی۔ آخر میں بڑے کارخانے کے ساتھ ترازے میں گرام اودیوگ ہار گئے۔ اس سکول کو کوئی سرکاری سپرستی حاصل نہیں تھی۔ اسی لیے وہ جاری تعلیمی نظام کے سامنے ٹک نہیں پایا۔ سرکاری طور پر اس سکول کے بچوں مستقبل پر ایک سوالیہ نشان لگ گیا۔ اسی طرح کی کئی اور وجوہات کی بنا پر لوگوں نے اپنے بچوں کو اس سکول میں بھیجنا بند کر دیا۔ بھودان، گرام دان تحریکیں میں بہت سے لوگوں نے ایک وقت اپنے بچوں کو، اس سکول میں داخل کیا تھا۔ لیکن انہیں بھی بعد میں اپنے بچوں کو نکالنا پڑا۔ معاشرہ اور سرکار اس نرالے سکول اور اس کی انوکھی ترکیب کا سہی اندازہ نہیں لگا سکے۔ آس پاس کا مخالف ماحول جلد اُسے نگل گیا۔ بعد میں گرام دان اندولن بھی نہیں ٹک پایا۔ معاشرے میں مادیت کی دوڑ نے اسے بالکل ہی بدل کر رکھ دیا۔ میری دلی تمنا ہے کہ میں اپنے بیٹے کو تعلیم کے لیے اُس جادوئی جزیرے میں بھیج دوں۔ لیکن اب وہ جادوئی سکول کہاں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

